محمد سعید الرحمٰن علوی

بزمِ شیخ الہندؒ کے گوہرِ تابدار

علامہ شبّیر احمد عثمانیؒ

۱۸۵۷ء کا سال برِعظیم پاک و ہند کے بسنے والوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے بہت ہی المناک اور اندوہناک تھا کہ ان کی حکومت کچلی گئی، ان کی روایات کا خاتمہ کرنے کی ظالمانہ تدابیر کی گئیں اور ہر حریت پسند بالخصوص اہلِ علم کو بری طرح مارا اور رسوا کیا گیا۔ بہر حال بلانوشانِ محبت نے ہمت نہ ہاری اور بہتر مستقبل کی تلاش کے لیے نئے سرے سے کمربستہ ہو گئے۔ اب کے انہوں نے تعلیم کا میدان منتخب کیا تاکہ اس کے ذریعہ جہاں اپنی روایات، علوم، کلچر اور تہذیب و ثقافت کا تحفظ ہو سکے وہاں وحدت و اجتماعیت کا اہتمام بھی ہو سکے۔

اس مقصد کے لیے دو زبردست علمی تحریکیں سامنے آئیں جن میں سے ایک کا نقطۂ آغاز دارالعلوم دیوبند تھا تو دوسرے کا جامعۃ العلوم علی گڑھ — یوپی کے مردم خیز خطوں اور قصبات میں ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند کی بڑی تاریخی اہمیت تھی۔ یہاں ایک مردِ درویش حاجی عابد حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تھے۔ انہوں نے ایک مکتب قائم کر رکھا تھا اسی مکتب نے آئندہ چل کر بین الاقوامی حیثیت حاصل کی۔ اس مکتب کو عظیم الشان علمی تحریک کا رنگ دینے کا سہرا دیوبند کے قریبی قصبہ نانوتہ کے ایک عالم کے سر ہے جن کا نام محمد قاسم تھا اور جو آج حجۃ الاسلام قاسم العلوم کے عقیدت مندانہ ہی نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ لقب و نام سے معروف ہیں۔

مولانا نانوتوی قدس سرّہ کے ساتھ اس میدانِ عزم و ہمت میں جو لوگ شریک تھے ان میں ایک نام مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تھا۔

مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبند کے باسی تھے۔ نہایت فاضل انسان۔ اردو ادب کے ماہر اور مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر تھے۔ کثیر العیال تھے لیکن ان میں سے تین صاحبزادوں نے بڑی شہرت حاصل کی:-

دیوبند کی بین الاقوامی درسگاہ کے سب سے پہلے باقاعدہ مفتی — مولانا مفتی

© rasailojaraid.com

عزیزالرحمٰن مجددی نقشبندی رحمہ اللہ تعالیٰ جن کے فتاوٰی کا عظیم الشان مجموعہ مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جن کی اصابت رائے، سیاسی تدبّر، انتظامی صلاحیتوں اور تصنیفی و تالیفی کمالات کا ایک زمانہ معترف ہے ـــ ایک عرصہ مادرِ علمی دیوبند کے مہتمم رہے جو سب سے زیادہ باوقار اور ذمّہ دار منصب ہے۔

اور تیسرے مولانا شبیر احمد عثمانی، جن کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا۔

دیوبند کے عثمانی شیوخ کے خانوادوں میں اس خاندان کو بہر طور بڑی اہمیت حاصل تھی اور مولانا فضل الرحمٰن اور پھر ان کے گرامی مرتبت فرزندان نے عالمانہ وقار، سیاسی تدبّر، عزم و ہمت اور اصابت رائے سے خاندانی عظمت کو چار چاند لگائے اور اپنے مدرسہ کے لیے وجہ افتخار بنے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی جنہوں نے ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بغداد الجدید بہاولپور میں آخری سفر اختیار کیا اور ۱۴ دسمبر کو کراچی میں مدفون ہوئے، عظیم مفسر، محدّث، نقّاد، متکلّم، خطیب اور بہت کچھ تھے ـــ عربی کا مشہور شعر

لَيْسَ عَلَى اللهِ بِمُسْتَنْكَرٍ ... اَنْ يَّجْمَعَ العَالَمَ فِي وَاحِدٍ

(اللہ تعالیٰ کے لیے یہ مشکل نہیں کہ ایک شخص کو مجموعۂ کمالات و خوبی بنائے) ـــ ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

دنیا کے ہر شعبہ میں "معاصرت" فتنہ کا سبب رہی لیکن علمی دنیا میں اس نے زیادہ ہی کانٹے بکھیرے ـــ کسی علمی شخصیت کا معاصرین کی طرف سے اعترافِ عظمت معمولی بات نہیں، اس حوالہ سے مولانا عثمانی بڑے ہی خوش قسمت ہیں کہ ان کے معاصرین نے ان کی خوبیوں کا اعتراف کیا اور بہ ملا!

مولانا کے معاصرین میں امام العصر مولانا سید انور شاہ کا نام نامی بڑا اہم ہے علامہ ہی وہ بزرگ عالم ہیں جن کی عظمت کا اعتراف فلسفی شاعر علّامہ اقبال نے فراخ دلی سے کیا ـــ شاہ صاحب اور مولانا ایک ہی استاذ کے شاگرد تھے یعنی امام حریت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کے ـــ پوری جماعت میں شاہ صاحب کو جو علمی برتری اور فضیلت حاصل تھی وہ مسلّم ہے لیکن شاہ صاحب نے مولانا المرحوم کی عظیم الشان کتاب "فتح الملہم" کے سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے مولانا کو علامۂ عصر اور اپنے دور و زمانہ کا محدّث، مفسّر اور متکلّم لکھا۔

(فتح الملہم ٹائٹل ص۳)

امام العصر مولانا عبید اللہ سندھی کے نام، کام اور ان کی قربانیوں سے ایک دنیا واقف ہے۔ انہوں نے فلسفہ ولی اللّٰھی کی ترجمانی کا حق ادا کیا اور طویل عرصہ حریت و آزادی کے لیے جلاوطنی کی زندگی گزار دی۔ ایک مقام پر بعض افکار کے حوالہ سے سندھی و عثمانی کے درمیان اختلاف کی خلیج بھی حائل ہوئی اور بہت شدید، لیکن ارباب صدق و صفا ذاتی دشمنیوں اور عداوتوں سے ماوراء ہوتے ہیں۔

مولانا عثمانی کا ایک عظیم الشان مقالہ ہے جس کا عنوان ہے " الروح فی القرآن" ـــــ ظاہر ہے کہ قرآن عزیز کا یہ مشکل ترین مسئلہ ہے۔ مولانا عثمانی نے جس خوبی و خوبصورتی سے اس ادق اور مشکل مسئلہ پر قلم اٹھایا اس کی اطلاع مولانا سندھی کو قیام مکہ معظمہ کے زمانہ میں ہوئی تو مولانا سندھی نے لکھا۔

> " اس کتاب کا ایک ایک لفظ میرے لیے نہایت بصیرت افروز ثابت ہوا۔ اس مشکل مسئلہ کو اس قدر آسان بیان کرنے کی داد جس قدر میرا دل دے رہا ہے اس برعظیم میں انہیں ایسے بہت کم ملیں گے۔ میں حضرت علامہ کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کی قوتِ بیانیہ کا مثل جانتا ہوں"۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا السید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ اور علامہ عثمانی کے باہم سیاسی اختلافات کا ہر ذی شعور کو علم ہے۔ مولانا مدنی تقسیم کے فلسفہ سے اختلاف رکھتے جبکہ مولانا عثمانی اس فلسفہ کے زبردست نقیب تھے لیکن مولانا مدنی نے علامہ کی وفات پر تعزیتی جلسہ میں فرمایا:

> "مرحوم کی شخصیت بے مثال تھی۔ علم و فضل میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ ہندوستان کے چیدہ علماء میں سے تھے۔"

مسٹر ابوسعید بزمی جیسے ذمہ دار صحافی نے روزنامہ احسان لاہور کے اداریہ (۱۴ر دسمبر ۱۹۴۹ء) میں لکھا:

> " وہ علمی فضیلت اور کردار کی بلندی دونوں اعتبار سے اتنے بلند مقام کے حامل تھے کہ پاکستان تو درکنار دنیائے اسلام میں بھی آپ کے پائے کی کوئی ہستی نہ تھی۔"

ملک نصر اللہ خان عزیز کا نام صحافتی دنیا میں بہت معتبر نام ہے۔ " مدینہ بجنور" جیسے اخبارات ملک صاحب کی ادارت میں چلتے رہے۔ آخری دور میں جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی

© rasailojaraid.com

کی تحریک سے وابستہ ہو گئے اور سید صاحب کے دفاع کا حق ادا کیا ـــــ دیوبند سے وابستہ سبھی افراد سید صاحب کے بعض افکار سے شدید اختلاف رکھتے اور مولانا عثمانی کی جنگِ کشمیر (۱۹۴۸ء) کے دَور میں سید صاحب سے مکاتبت ہوئی جس کی تفصیل "مکتوباتِ عثمانی" میں موجود ہے ۔ سید صاحب نے جنگِ کشمیر کے شہداء کے خلاف بہت ہی افسوسناک رویّہ اختیار کیا اور یوں ایک بڑے نازک موقع پر دانستہ یا نادانستہ ملک کے دفاعی مورچہ کو کمزور کرنے کی سعی کی ۔

واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب قلم کے شاہ سوار تھے اور یہ مولانا عثمانی ہی تھے جنہوں نے سید صاحب کے افکار کا تار و پود بکھیر کر جنگِ کشمیر کی اہمیت واضح کی ۔

اس اعتبار سے ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم کا دل مولانا سے میلا رہا اور یہ قدرتی بات تھی لیکن مولانا کی وفات پر ملک صاحب حقیقت نگاری پر مجبور ہو گئے اور لکھا:

"مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبند کے مدرسہ علم و فقہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے سینے میں ایک دل بیدار و صحت یاب تھا جو ان کی تمام احتیاطوں کے باوجود ان کو میدانِ عمل میں لیے پھرتا تھا ۔ سب سے پہلے وہ تحریکِ خلافت و عدم تعاون میں عوام کے سامنے آئے ۔ وہ ایک جادو بیان مقرر تھے ۔ لاہور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں جمعیۃ علماء ہند کی کانفرنس ہوئی تھی اس میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریر نہایت معرکہ آرا تھی ۔" (تسنیم ۲۰، دسمبر ۱۹۴۹ء)

معاملہ اسی پر بس نہیں کرتا ۔ خلافت عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام (یہ منصب درحقیقت چیف جسٹس کے برابر تھا) اور متعدد علمی کتابوں کے فاضل مصنف علامہ زاہد الکوثری نے حضرت مولانا کی حدیثی خدمت "فتح الملہم" پر نہایت شاندار تقریظ لکھی ـــــ "مسلم" حدیث پاک کی چھ اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے جسے بخاری کے بعد دوسرا مقام حاصل ہے ۔ بقول ایک مفکر حنفی دنیا پر اس کتاب کا قرض اتنے طویل عرصہ بعد مولانا عثمانی نے چکایا ـــ

علامہ الکوثری کی تقریظ کے آخر میں ہے (ترجمہ از عربی)

" اس کتاب (فتح الملہم) کے مؤلف، فاضل اجل، سراپا حجت، علومِ مختلفہ کے جامع، زمانہ کے محقق، مفسّر، محدث، فقیہ، قابل، نقاد، غوّاصِ علوم مولانا شبیر احمد عثمانی .... مدیر دار العلوم دیوبند ...... جو ہندوستان کا ازہر ہے ۔الخ"

d.com

ایک قدم آگے بڑھائیں تو مولانا اس وقت خوش قسمتی کے اس درجے پر نظر آتے ہیں کہ رشک آنے لگتا ہے ـــــ شاگرد، عقیدت مند اور چھوٹے، استاذوں، مشائخ اور بڑوں کا احترام کرتے ہی ہیں لیکن کسی بڑے کا اپنے چھوٹے پر اعتماد وہ سرمایہ ہے جس کی دنیا میں قیمت نہیں، مولانا المرحوم کو اپنے استاذ گرامی شیخ العالم مولانا محمود حسن کا جس قدر اعتماد حاصل تھا اس کا اندازہ مشہور محقق عالم، مصنّف اور علیگڑھ یونیورسٹی کے فاضل استاذ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تحریر سے ہوگا :

"حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مالٹا سے آنے کے بعد آپ (مولانا عثمانی) نے ۱۹۱۹ء کے آخر اور ۱۹۲۰ء کے شروع میں سہارنپور، غازی پور، لکھنؤ، بنارس، کانپور، علیگڑھ، دہلی کے بڑے بڑے اجتماعات میں حضرت شیخ الہند کے ترجمان کی حیثیت سے جو بلند پایہ تقریریں کیں انھوں نے ملک کے گوشے گوشے میں (مولانا عثمانی) کی عظمت و برتری کا سکہ بٹھا دیا۔"

(دہلی برہان جنوری ۱۹۵۰ء)

اور اس کی شہادت سید سلیمان ندوی نے بھی اپریل ۱۹۵۰ء کے معارف اعظم گڑھ میں دی۔

"استاذ گرامی سے اس مناسبت کا ہی اثر تھا کہ شیخ الہند نے مالٹا کی اسارت میں قرآن عزیز کے ترجمہ کی تکمیل کر کے مختصر حواشی کا سلسلہ شروع کیا جو بعد میں آپ کی علالت اور پھر وفات کے سبب نامکمل رہ گیا تو اس کی تکمیل کی سعادت مولانا کے حصہ میں آئی۔ ان تفسیری حواشی پر اُس وقت کے ہندوستان کے سبھی جلیل المرتبت علماء نے گراں قدر آراء لکھیں۔

مشہور عالم و مؤرخ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی رائے کے چند جملے :

"مولانا عثمانی، علماء دیوبند میں اپنی قرآن دانی اور تدبّر فی القرآن کے متعلق جو خصوصیت رکھتے ہیں اس نے مولانا کو میرا محبوب اور ان کے تصور کو میرے دل کی راحت بنا دیا ہے۔"

یہ ترجمہ اور تفسیری حواشی شاہ افغانستان کے حکم سے فارسی میں ترجمہ ہو کر فارسی علاقوں میں مقبول عام ہوئے ـــــ اسی کو آج کل جماعت اسلامی وسیع پیمانے پر چھاپ کر افغان علاقوں میں پھیلا رہی ہے ـــــ فارسی نسخہ کی اشاعت پر کابل کی عظیم دینی درسگاہ "فخر مدارس" کے جلیل القدر اساتذہ نے اسے سر آنکھوں پر رکھا اور اجتماعی انداز سے عظیم الشان تقریظ لکھی۔

© rasailojaraid.com

حضرت مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ مولانا عثمانی نے فرمایا کہ میں نے قدیم و جدید تفاسیر کو دقتِ نظر سے پڑھ کر ان کا مغز و نچوڑ چند چند سطروں میں پیش کیا جس پر میرے کئی سال صرف ہوئے ـــــ قدیم و جدید علوم و فنون کے حوالہ سے آپ اس تفسیری ذخیرہ کو دیکھیں تو عثمانی صاحب کا قلم ہر جگہ آپ کی خوب رہنمائی کرتا نظر آئے گا۔

قرآن عزیز کے بعد امت مسلمہ کے لیے حدیث دوسرا عظیم سرمایہ ہے۔ مولانا المحترم نے تفسیری خدمت کے بعد حدیث کی اہم ترین کتاب "مسلم" کی عظیم الشان شرح لکھی جس کے متعلق بعض آراء سامنے آ چکی ہیں۔ انہوں نے خود شیخ الهند جیسے استاذِ کامل سے حدیث پڑھی اور امتیازی طور پر امتحان میں کامیابی حاصل کی ـــــ علامہ کوثری کی رائے کا ایک جملہ مزید ضرور پڑھیں۔ انہوں نے اسی کتاب کی تقریظ کے ساتھ لکھا کہ :

"مولانا۔ حق یہ ہے کہ آپ اس دور میں "فخر حنفیہ" ہیں۔"

اور مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے لکھا کہ :

"احناف پر مسلم کے سلسلہ میں جو قرض تھا مولانا نے مبسوط اور مستند شرح لکھ کر اس فرض کفایہ کو ادا کیا۔" (صدق لکھنو۔ دسمبر ۱۹۴۹ء)

مولانا نے اس حدیثی شرح کے مقدمہ میں علم حدیث کے تعارف پر جو مبسوط تحریر لکھی وہ حقیقت میں بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ باقی ایک ایک حدیث میں نہایت معتدل کلام اور جامع بحث انہی کا حصہ ہے ـــــ مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس حدیثی خدمت پر ۱۲۷ اشعار پر مشتمل عربی قصیدہ لکھا۔ پہلے شعر کا ترجمہ ہے :

اے نجم ہدایت! آپ کو ہر مسلمان مبارک باد دیتا ہے
اس چیز پر کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرح مسلم کی توفیق بخشی

حدیث کے بعد علم فقہ مسلم دنیا کا عظیم علمی سرمایہ ہے جس نے پوری مسلم تاریخ میں قدم قدم پر انسانیت کی رہنمائی کی۔ حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان میں ان صحابہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی جنھیں تفقہ میں امتیازی مقام حاصل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی ہی نعمت ہے اور قرآن و سنت کے احکامی حصہ کی گہرائیوں کو تفقہ کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی ہی صدی کے عظیم المرتبت تابعی امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقام مسلّم و ثابت ہے۔ گو کہ حضرت مولانا کی اس فن میں کوئی باقاعدہ تالیف نہیں لیکن تفسیری حواشی، شرحِ

d.com

احادیث اور اپنے بعض مقالات و مکتوبات میں اس حوالہ سے ان کی عظمت کا جگہ جگہ ثبوت سامنے آتا ہے۔ اکابر دیوبند میں اور جدید دنیا کے اہل علم میں آلہ مکبر الصوت کے سلسلہ میں رہنمائی کا فرض موصوف نے انجام دیا۔ اس سلسلہ میں مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم و مغفور کے نام ان کا ایک نہایت وقیع خط موجود ہے جو "تجلیاتِ عثمانی" کے فاضل مؤلف نے من و عن نقل کیا ہے۔ اس مکتوبِ گرامی میں مرحوم کے فقہی استنباطات اور اجتہادی شان نمایاں ہے اور بہت ہی قابلِ قدر بحث نظر آتی ہے۔ کفار کے ساتھ موالات اور جہاد کشمیر کے حوالے سے ان کے مکاتیب، خطبے اور تحریرات ان کی مبصرانہ اور فقیہانہ شان کے غماز ہیں ــــ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے حقیقت یہ ہے کہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے جہاد کشمیر کے سلسلہ میں جس طرح ادھورے حوالے اور ناتمام ابحاث کے ذریعے اضطراب پیدا کیا اس کا مؤثر دفاع مولانا جیسا حکیم فقیہ اور مبصر و نقاد ہی کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی اُس دور کے نہایت ہی نازک مسائل مثلاً مسئلۂ قومیت وغیرہ پر بھی نہایت عالمانہ اور فقیہانہ انداز میں مولانا نے گفتگو کی۔

حضرت مولانا عثمانی کی فقہی بصیرت کا شاہکار ان کی وہ تقریریں ہیں جو انھوں نے سعودی حکومت کے قیام کے بعد مؤتمر مکہ میں سلطان ابن سعود کی موجودگی میں ارشاد فرمائیں۔

اہل علم جانتے ہیں کہ سعودی خاندان، شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے تعاون اور ان کی فکر کی بنیاد پر برسر اقتدار آیا تھا۔ شیخ نجدی حنبلی فقہ کے علمبردار اور امام اہل سنّت حضرت احمد بن حنبل کے مقلّد تھے۔ مخلص انسان تھے لیکن طبیعت میں جذباتیت تھی۔ اسی کے پیش نظر حرمین شریفین میں مآثر قدیمہ کو گرا دیا گیا۔ اور قبور پر قبّے وغیرہ منہدم کر دیئے گئے۔ شیخ کے پیرو اتنے متشدد تھے کہ الامان۔ جذبہ بظاہر ان کا اچھا تھا لیکن حکمت و بصیرت کی بڑی کمی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ممکن ہے کہ وہ درود شریف میں لفظ "سیّدنا" کے حق میں نہ تھے کہ ان کے بقول یہ لفظ احادیث سے ثابت نہیں لیکن دیوبندی علمی تحریک کے ایک عظیم اسکالر الشیخ خلیل احمد سہارنپوری نے وہ حدیث پیش کی جس میں نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے متعلق فرمایا:

> کہ میں قیامت کے دن تمام اولادِ آدم کا سردار (سیّد) ہوں گا
> لیکن اس پر مجھے فخر نہیں (کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے)۔

بہر طور سلطان ابن سعود نے مولانا کی بات کا وزن محسوس کیا اور نجدی علماء نے بھی

© rasailojaraid.com

اس کے بعد ضد نہ کی ـــــ

بہرحال قبوں کے انہدام اور مآثر کے گرائے جانے پر خوب ہنگامہ ہوا۔ یہاں ہندوستان میں بھی شدید افراتفری تھی۔ اس زمانہ میں سلطان نے ایک مؤتمر منعقد کی جس میں مجلس خلافت اور جمعیۃ علماء ہند کے دو وفد شریک ہوئے۔ جمعیت کے وفد میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی مولانا عثمانی اور مولانا عبدالحلیم صدیقی تھے۔

ان تقاریر میں مولانا نے جس طرح شرک اور شرکیہ رسوم، نیز رسوم و رواج میں ملوث مسلمانوں کے متعلق مبصرانہ اور فقیہانہ گفتگو کی اس پر سلطان بے حد متاثر ہوا۔ اور کہا:

" میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ کے خیالات اور بیان میں بہت رفعت اور علو ہے۔"

سلطان کی مجلس علماء کے اعلیٰ رکن شیخ عبدالعزیز عتیقی نے کہا کہ:

" ہم مولانا کی تقریر سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئے۔"

اسی طرح اس موقع کی عظیم الشان ابحاث اہل علم کے لیے بڑا سرمایہ اور قابل مطالعہ ہیں۔

مولانا نے سرسید احمد خان مرحوم سے ہزار اختلاف کے باوصف ان کے معاملہ میں متشددانہ رائے رکھنے والوں پر واضح کیا کہ کفر و ارتداد کی بحث اسلام کے نازک ترین مباحث میں سے ہیں۔ ایسے مسائل میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس سے آگے بڑھیں کہ امت مسلمہ کے علمی سرمایہ میں علم کلام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس علم کا تعلق عقائد کے نازک موضوع سے ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں: " اس علم کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔"

صدر اسلام میں اس فن کا معاملہ بہت سادہ اور آسان تھا کہ کفر و اسلام کی دنیا واضح تھی لیکن یونانی فلسفہ میں غلو کے سبب یہاں بھی نازک صورت حال پیدا ہو گئی اور نئے نئے اسکول جنم لینے لگے۔ ابتدائی دور کی سادگی کا اندازہ حضرت الامام ابوحنیفہ قدس سرہ کی مختصر کتاب "فقہ اکبر" سے لگایا جاسکتا ہے لیکن بعد کے حالات کے سبب اشعری، ماتریدی، رازی، غزالی، شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے حضرات کو بڑی کاوشیں کرنا پڑیں ـــــ ابتدائی دور کے معتزلہ کی طرح آخری دور کے جدت پسندوں پر اتمام حجت کی غرض سے مولانا محمد قاسم نانوتوی سامنے آئے۔ انہوں نے جدید مسیائیت، ہندومت اور رفض و سبائیت کے اپنے دور کے فتنوں

.com
d.com

کے سامنے بڑی خوش اسلوبی سے بند باندھا۔

مولانا محمد قاسم کے رسائل وکتب کا اکثر یہی موضوع ہے اور ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے ممکن ہے کہ مولانا محمود حسن دیوبندی جیسے استاذ الاساتذہ نے اپنے شیخ مولانا محمد قاسم سے براہِ راست ان رسائل وکتب کو سبقاً سبقاً پڑھا اور پھر اپنے شاگردوں کو پڑھایا جن میں مولانا عبیداللہ سندھی مولانا انور شاہ، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے ارباب علم شامل تھے۔ مولانا قاسم نانوتوی حلقۂ متکلمین میں بڑی رفعت کے مالک ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے بقول:

> "مولانا قاسم کی تصانیف کا موازنہ رازی، غزالی سے کرو تو ان کی تصانیف اُن کی تصانیف سے کم نہ ہوں گی۔

سرسید احمد خان نے مولانا کی وفات پر جو طویل نثری مرثیہ لکھا وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے مولانا قاسم کے دوسرے کمالات کے ساتھ اس پہلو پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ بخوفِ طوالت اس کی نقل ممکن نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اردو میں ایسے نثری مرثیہ کی مثال ڈھونڈنی مشکل ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی اس بات کے زبردست علمبردار تھے کہ مولانا قاسم کی تصانیف باقاعدہ شامل نصاب کی جائیں تاکہ عصری وکلامی مسائل سے طلبہ کما حقہ واقف ہوسکیں۔

مولانا قاسم کی کتابوں کی اہمیت کا اندازہ بڑے لوگ ہی کرسکتے تھے اور قدرت کا عجیب معاملہ تھا کہ اس سلسلہ میں مولانا شبیر احمد پورے حلقہ میں اُن کی زبان شمار ہوتے جس کی وجہ سے مراد آباد کے "جلسۂ مؤتمر الانصار" میں مولانا اشرف علی نے اپنا عمامہ اُن کے سر پر رکھ دیا۔ مولانا عثمانی کی کتاب "الروح فی القرآن" پر مولانا سندھی کی رائے گزر چکی ہے ــــــ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:-

> "مولانا عثمانی کو مولانا نانوتوی کے علوم ومعارف پر احتوا ہے وہ مولانا کے علوم ومعارف اس طرح اپنی زبان سے بیان کرتے کہ وہ دل نشین ہوجاتے۔"
>
> (معارف، اپریل ۱۹۵۰ء)

بقول مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد قاسم اپنے مرشد ومربی حضرت حاجی امداداللہ کی زبان تھے ــــــ تو مولانا عثمانی مولانا قاسم کی؛ حتی کہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے انہیں اپنے دور کے متکلم اعظم امام ابوالحسن اشعری کی زبان قرار دیا۔

© rasailojaraid

مولانا عثمانی نے دورِ حاضر کے دانشوروں کی علمی بے بضاعتی پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

"کوئی صاحب چند جرمنی اور فرانسیسی مصنفین کے اقوال یاد کر لینے سے اپنے آپ کو ماہر علوم جدیدہ تصوّر کرتے ہوں تو بحمد اللہ ہم بھی اس سے عاجز نہیں۔"

اور اس کا واقعی اندازہ ان کے تفسیری حواشی، حدیثی نوٹس اور دوسرے مقالات سے ہوتا ہے جہاں انہوں نے دنیائے جدید کے لچر، بے ہودہ اور محض پوست ہی پوست افکار کو جابجا نقل کر کے ان پر نہایت عالمانہ تنقید کی اور ان کی غلطیاں الم نشرح کر کے واضح کیا کہ ملّائے مکتبی کا علم و دانش دانشورانِ فرنگ سے زیادہ گہرائی و گیرائی رکھتا ہے اور الحاد زدہ دانشور ملّا کی گرد پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ موقع و فرصت ہوتی تو ہم اس کے حوالے ضرور دیتے۔ اس سلسلہ میں وجودِ باری، مسئلہ نبوت، معراج جسمانی، وزن اعمال، تقدیر، نزول مسیح جیسے مسائل پر مولانا کے نوٹس ضرور دیکھ لیے جائیں تو انشاء اللہ تعالیٰ ہمارے دعویٰ کی تائید ہو جائے گی۔

منطق (لاجک) اور فلسفہ معقولات کی دو نہایت ہی اہم شاخیں ہیں آن کا زیادہ تر تعلق چونکہ عقل سے ہے اس لیے وحی الٰہی کی سرپرستی و تائید کے بغیر بالعموم لوگ یہاں بھٹک جاتے ہیں۔ مناطقہ اور فلاسفہ کی تاریخ اس لحاظ سے بڑی المناک ہے۔ ان حضرات نے جس طرح ٹھوکریں کھائیں اور اپنے ساتھ کئی دوسروں کو بھی لے ڈوبے وہ کوئی ڈھکی چھپی داستان نہیں لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ حسنِ توفیق سے نوازے وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی عقل سے کام لے کر ٹھوس اور مثبت خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔ مسلم تاریخ میں رازی، غزالی، ابنِ رُشد جیسے حضرات نے بہت ہی وقیع خدمات سرانجام دیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی بلاشبہ اس حوالہ سے بڑی عظمت کے حامل تھے۔ مولانا کے بعض دوستوں نے زمانہ طالب علمی میں ہی ان فنون سے مولانا کی دلچسپی کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ مولانا کے استاذِ گرامی مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ ادارہ "جمعیۃ الانصار" کے سٹیج پر مولانا نے جو علمی مقالات پڑھے اور تقریریں کیں ان کی علمی دنیا میں دھوم مچ گئی۔ جمعیۃ الانصار کے نائب ناظم مولانا سراج احمد نے اجلاس میرٹھ (۱۹۱۲ء) میں مولانا کی تقریر کے فلسفیانہ رنگ لیکن عام فہم زبان کا بڑے مزے سے ذکر کیا ہے۔ اجلاس مرادآباد میں "وجود باری تعالیٰ" اور "خلق افعال" جیسے نازک اور پیچیدہ اور مشکل سوالات

d.com

پر مولانا کی تقاریر کا اعتراف مولانا کے ہم عصر اور نہایت عبقری عالم مولانا عبید اللہ سندھی نے اس طرح کیا:

"بعد از عصر مولانا شبیر احمد عثمانی کا وعظ ہوا۔ جو "وجود واجب الوجود" اور "خلقِ افعال" وغیرہ کی ابحاث پر خالص فلسفیانہ رنگ میں ہوا۔ چونکہ اس اجلاس کو خاص اہلِ علم کے لیے مخصوص کیا گیا تھا اس لیے انہوں نے بڑی توجہ اور انہماک سے سُنا۔"

(روداد مؤتمر ص ۱۳۲)

"الروح فی القرآن"، "معجزات نبوی" اور ایسے ہی مسائل پر مولانا کے قرآن عزیز میں طویل اور مفصل نوٹس اور دوسرے مقامات پر ان کی نگارشات نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ منقولات کی طرح معقولات میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں۔ "سجود الشمس" ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے جسے ہمارے مناطقہ اور فلاسفہ نے اور بھی گمبھیر بنا دیا ہے۔ لیکن مولانا کے باغ و بہار قلم نے اس گتھی کو جیسے سلجھایا اس کے لیے مولانا کی علمی سوانح "تجلیاتِ عثمانی" کے متعلقہ حصص کا مطالعہ بڑا مفید ہوگا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ دار العلوم دیوبند کی چٹائیوں پر بیٹھنے والے اور پورا تعلیمی مرحلہ وہاں پورا کرنے والے شخص کی جدید ماہرین کی تعلیمات، مصنفات اور نگارشات پر کتنی گہری نظر ہے۔ اور ایک مولانا عثمانی پر ہی بس نہیں کم از کم دیوبند کی علمی تحریک کے ان گنت افراد ایسے گنوائے جا سکتے ہیں جنہوں نے ان علوم کے ماہرین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ بالخصوص مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا عبدالسمیع رام پوری، مولانا رسول خان ہزاروی جیسے حضرات تو فی الواقع ائمہ عصر حاضر تھے۔

اسی کے ساتھ ایک اور شعبہ مناظراتی ادب کا ہے جس میں سچ یہ ہے نقل سے زیادہ عقل کا کاروبار چلتا ہے۔ اہلِ علم خوب جانتے ہیں کہ برعظیم پاک و ہند میں اس فن کے امام حضرت سراج الہند مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تھے۔ ان کے بعد اس فن میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خان اکبر آبادی، مولانا رسول خان چڑیا کوٹی کو بھی بڑا امتیازی مقام حاصل ہے۔ مولانا عثمانی نے اس فن میں اپنے اسلاف کی یادیں تازہ کر دیں۔ آریہ سماج ہوں یا قادیانی، جدید شبہات کے مارے ہوئے نوجوان ہوں یا اہلِ بدع و ہوا، مولانا نے قرآن حکیم کے بلیغانہ اصول اور مناظراتی زبان میں زبان و قلم سے بڑی دقیع خدمت سرانجام دی۔ مولانا کے مقالات اعجاز القرآن، صدائے ایمان اور الشہاب اس رنگ کے امتیازی مقالات

© rasailojaraid.com

ہیں۔

تصنیفی، تالیفی اور ترجمہ و تشریح کی عظیم الشان خدمات کے علاوہ ایک بہت ہی اہم خدمت "تبلیغ اسلام" ہے جس کا تعلق زبان سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جملہ نبی اسی مؤثر ترین ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو خالق کائنات کا پیغام پہنچاتے۔ پیغمبر اسلام نے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اس خدمت کو امت کے سپرد کر دیا کہ آپ آخری نبی تھے۔ تبلیغ اسلام قرآن کے حوالے سے ایسے ہی فرض ہے جیسے نماز روزہ۔ قرآن کریم نے تبلیغ کے حوالہ سے "حکمت، موعظہ حسنہ اور جدال احسن" کی تلقین کی ساتھ ہی پیغمبر اسلام نے سامعین کی ذہنی استعداد کا لحاظ رکھنے کی تلقین کی۔ ایک کامیاب مبلّغ وہی ہوتا ہے جو ہر سطح کے عوام کو متاثر کر سکے اور انہیں پیغام حق پہنچا سکے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کو قدرت نے یہ ملکہ خوب عطا فرمایا تھا۔ فلاسفہ، متکلمین، علماء، اہل سیاست اور عوام سبھی تک آپ پہنچے اور اس فرض کی ادائیگی کا حق ادا کیا۔

۱۹۳۸ء کی بمبئی مسلم لیگ کے اجلاس میں ارباب لیگ کے پاس جو وفد احقاق حق کی غرض سے گیا اس کے امیر حضرت مولانا ہی تھے۔ جس نے جدت کے مارے ہوؤں کو راہ راست کی تبلیغ کی۔ مولانا مرحوم جس پایہ کے مبلّغ، مقرر اور خطیب تھے اس کا اندازہ بعض آراء سے ہو سکتا ہے۔ ملک نصر اللہ خان عزیز جیسے سکہ بند جماعت اسلامی کے صحافی نے ۱۹۲۰ء کی جمعیۃ علماء ہند کانفرنس لاہور میں مولانا ابو الکلام آزاد جیسے عبقری اور جینئس انسان کی صدارت میں مولانا کی معرکۃ الآراء تقریر کا بڑے اہتمام سے ذکر کیا۔ (تسنیم ۲۰ دسمبر ۱۹۴۹ء)

مولانا ظفر علی خان مرحوم جیسے زبان و قلم کے دھنی نے مولانا کی واعظانہ، مقررانہ اور خطیبانہ جادوگری کا دل کھول کر اعتراف کیا (زمیندار ۲۰ دسمبر ۱۹۴۸ء) جبکہ امروز لاہور (۱۶ دسمبر ۱۹۴۹ء) قندیل لاہور (۲۰ دسمبر ۱۹۴۹ء) روزنامہ آزاد لاہور (مجلس احرار اسلام کا اخبار، ۲۲ دسمبر ۱۹۲۰ء) سبھی نے مولانا کی اس خوبی کا اعتراف کیا۔ مولانا محمد یوسف بنوری نے مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو ہندوستان میں خطابت کے "ائمہ اربعہ" کے نام سے یاد کیا لیکن آپ حیران ہوں گے کہ سید سلیمان ندوی جیسے حضرات مولانا کی اس معاملے میں مسلّمہ مہارت کے دل و جان سے معترف تھے۔
(معارف اعظم گڑھ اپریل ۱۹۵۰ء)

مولانا کی خطیبانہ عظمت کے جوہر اس وقت کھلے جب وہ پاکستان پارلیمنٹ کے ممبر

کے طور پر سامنے آئے۔ ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ میں بڑے گھاگ قسم کے لوگ تھے لیکن مولانا کی خطیبانہ عظمت کو بہت سوں نے دل و جان سے تسلیم کیا اور خاص طور پر لیاقت علی خان مرحوم تو آپ کے بہت ہی قدر دان تھے۔ قرار دادِ مقاصد جو مرحوم لیاقت علی خان نے پیش کی اس کی تائید میں مولانا کی تقریر جسے بجا طور پر "روشنی کا مینار" کہا جا سکتا ہے، خطابت کی دنیا میں ایک شاہکار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا خطیب اعظم "سحبان" یا یورپ کا "چرچل" "علم و ثقاہت کے موتی لٹا رہا ہے۔

مولانا المرحوم جیسا کہ بار بار سامنے آیا محض ملائے مکتبی تھے۔ دیوبند کی چٹائیوں کے علاوہ کہیں انہوں نے ایک لفظ نہیں پڑھا۔ لیکن آپ کے لیے یہ بات وجہ حیرت ہوگی کہ وہ جہاں عربی فارسی کے مسلمہ ادیب اور قلمکار تھے وہاں اردو ادب میں بھی ان کا مقام نمایاں تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد علی جوہر اور سید سلیمان ندوی جیسے حضرات نے ان کی عظمت کا لوہا مانا جبکہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے، عبد الماجد دریا آبادی جیسے حضرات تو آپ کو اپنا استاذ ماننے پر مجبور ہیں۔ الغرض مولانا کو جس پہلو سے دیکھیں وہ عبقری اور جینئس نظر آتے ہیں، کوئی علم ہو اور کوئی فن، اس میں وہ امامت و قیادت کے درجے پر فائز ہیں۔

مولانا محمد طاسین کی معرکۃ الآراء تصنیف

مروجہ نظام زمینداری اور اسلام

عمدہ سفید کاغذ دیدہ زیب طباعت خوبصورت اور مضبوط جلد

قیمت ۳۵ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن

© rasailojaraid.com